علم

توجیہی یا تخلیقی

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری

MINHAJ-UL-QURAN PUBLICATIONS

منہاج القرآن پبلیکیشنز

علم

توجیہی یا تخلیقی

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

منہاجُ القرآن پبلیکیشنز
365-ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 3-5169111
یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 7237695
www.Minhaj.org - www.Minhaj.biz

جملہ حقوق بحقِ تحریکِ منہاجُ القرآن محفوظ ہیں

نام کتاب : علم - توجیہی یا تخلیقی

تصنیف : شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

پروف ریڈنگ : حافظ عبد الرشید

زیرِ اہتمام : فریدِ ملّتؒ ریسرچ اِنسٹی ٹیوٹ Research.com.pk

مطبع : منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور

اِشاعت نمبر 1 : جنوری 1987ء (2,000)

اِشاعت نمبر 2 : مئی 1987ء (5,000)

اِشاعت نمبر 3 : فروری 1998ء (1,100)

اِشاعت نمبر 4 : دسمبر 1998ء (1,100)

اِشاعت نمبر 5 : مئی 2013ء (1,200)

قیمت : -/30 روپے

❁❁❁

نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات و لیکچرز کے کیسٹس اور CDs و DVDs سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لیے **تحریکِ منہاجُ القرآن** کے لیے وقف ہے۔

fmri@research.com.pk

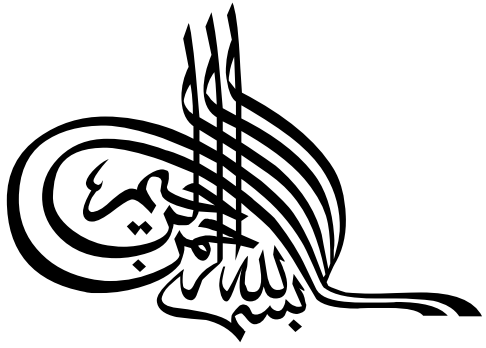

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا
عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

فَاقَ النَّبِیِّیْنَ فِی خَلْقٍ وَّفِی خُلُقٍ
وَلَمْ یُدَانُوْهُ فِی عِلْمٍ وَّلَا كَرَمِ

﴿صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَ بَارَكَ وَسَلَّمَ﴾

حکومتِ پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔ا) ۴-ا / ۸۰ پی آئی وی، مؤرّخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء؛ حکومتِ بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷-۴-۴-۲۰ جنرل و ایم ۴ / ۹۷۰-۷۳، مؤرّخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء؛ حکومتِ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی چٹھی نمبر ۲۴۴۱۱-۶۷ این۔ا / اے ڈی (لائبریری)، مؤرّخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء؛ اور حکومتِ آزاد ریاست جموں و کشمیر کی چٹھی نمبر س ت/ اِنتظامیہ ۶۳-۸۰۶۱/ ۹۲، مؤرّخہ ۲ جون ۱۹۹۲ء کے تحت شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کی تصنیف کردہ کتب تمام تعلیمی اِداروں کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

زیرِ نظر موضوع میں دو اُمور قابلِ توجہ ہیں:

۱۔ علم کیا ہے؟

۲۔ سطحی و توجیہی (facile & causative) اور تخلیقی و ایجادی (creative & originating) علم میں کیا فرق ہے؟

دونوں سوالات کا جواب دے کر ہمیں عصری اَفکار و علوم کی نوعیت کو متعین کرنا ہے کہ وہ کس درجے میں ہیں تاکہ تنقید و تجزیہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ سکیں کہ ہمارے مفکرین اور نصابِ تعلیم کے مدوِّنین قوم کے لیے جو علمی و فکری سرمایہ مہیا کر رہے ہیں، کیا وہ ہماری ضروریات اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے؟ اور اس سے قومی و ملی مسائل کے عملی حل میں کوئی مؤثر مدد مل سکتی ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہو تو پھر غور طلب امر یہ ہوگا کہ تعلیمی و تحقیقی زندگی میں کس قسم کی تبدیلی درکار ہے جس سے علوم کو تازہ زندگی میسر آئے اور مطلوبہ نتائج کے حصول کی قطعی ضمانت دی جاسکے۔ چنانچہ ہم سب سے پہلے 'علم' کا مفہوم واضح کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے حوالے سے سطحی و تخلیقی علم کا فرق واضح ہو سکے۔

علم کی تعریف یوں کی گئی ہے:

اَلْعِلْمُ: اِدْرَاکُ الشَّیْءِ بِحَقِیْقَتِهٖ.

علم کسی شے کو اس کی حقیقت کے حوالے سے جان لینے کا نام ہے۔

یعنی علم ایک ایسا ذہنی قضیہ اور تصوّر ہے جو عالمِ خارج میں موجود کسی نہ کسی

حقیقت کو جان لینے سے عبارت ہے۔ اس لحاظ سے مطلقاً علم کے چار ارکان قرار پاتے ہیں:

۱۔ ناظر (observer)

یعنی جو شخص جاننا چاہتا ہو۔ یہ درجہ انسان کو حاصل ہے۔ اسے عالِم بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ منظور (object)

جسے دیکھا یا جانا جا رہا ہو۔ اس سے مراد کوئی حقیقت (being or reality) ہے، خواہ اس کا وجود عقلی ہو یا حسی۔ تمام کائنات اور اس کے مادّی و غیر مادّی موجودات و حقائق 'منظور' کا درجہ رکھتے ہیں۔

۳۔ اِستعدادِ نظر (observing capability)

ناظر میں جاننے کی صلاحیت اور استعداد ہو۔ اگر حقیقت (یعنی منظور) حسی نوعیت کی ہے تو ناظر کو حواس[1] کی استعداد حاصل ہونی چاہیے، جن کے ذریعے ناظر اس وجود کو محسوس کر سکے۔ اگر منظور عقلی نوعیت کا ہے تو ناظر میں اُسی قدر اِستعدادِ عقل[2] ہو جس سے اسے سمجھا جا سکے۔ اِسی طرح وجدان[3] اور وحی[4] بھی دو ذرائع ہیں جن سے حقائق کا علم حاصل ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ حواس، عقل اور وجدان کے ذرائع تمام انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں اور ان میں انسان کے کسب و اِختیار کو دخل ہوتا ہے۔ لیکن وحی انسان کا کسبی ذریعہ نہیں، محض خدا کی عطا اور وہب ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام کو حاصل ہوتی ہے۔ اس میں غیرِ نبی اپنی تمام تر اِستعداد کے باوجود شریک نہیں ہوسکتا۔

۴۔ منظوریت (objectivity)

وہ حقیقت - جسے جاننے کی کوشش کی جاتی ہے - اس قابل ہو کہ معلوم ہو سکے۔ اگر وہ ناظر کی کسی مخصوص استعداد کے ذریعے جانی ہی نہ جا سکے تو علم حاصل نہیں ہوسکتا۔

مذکورہ بالا وضاحت کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی شخص جب کسی بھی ایسی حقیقت یا وجود کی نسبت جو عالمِ خارج میں پایا جائے، اِدراک اور غور وفکر کے نتیجے میں اپنے ذہن میں ایک تصور اور قضیہ قائم کرتا ہے تو اس قضیے کو علم کہا جاتا ہے۔ اب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ قضیہ یا تصور اپنی خارجی حقیقت کے عین مطابق ہو۔ اس قضیے اور خارجی حقیقت میں جس قدر باہمی مطابقت وموافقت ہوگی، اُسی قدر علم صحت کے درجے پر فائز ہوگا۔ اگر ذہنی تصور اور خارجی حقیقت کے درمیان مطابقت کے بجائے تناقض ہو تو وہ علم صحت و اِستعداد کے درجے سے گر جائے گا۔ لہٰذا علم کی صحت اس کی واقعیت پر منحصر ہے۔ بالفاظِ دگر علم کا صحیح (real) ہونا اس کے واقعی (actual) ہونے پر منحصر ہے۔ اِس اَمر کو اگر مزید عام فہم انداز میں بیان کرنا مقصود ہو تو یوں کہا جائے گا کہ فکر اگر مطابقِ واقعہ ہو تو علم صحیح ہے اور اگر مطابقِ واقعہ نہ ہو تو علم غیر صحیح۔ گویا علمِ واقعی (actual knowledge) ہی علمِ حقیقی (real knowledge) ہے۔

علم کے مفہوم کو سمجھ لینے کے بعد اس کے سطحی یا تخلیقی ہونے کا فیصلہ اس طرح کیا جائے گا کہ عالمِ خارج میں موجود حقیقتیں (beings) اگر تصور یا قضیے کی حد تک رہیں تو یہ علم سطحی ہے اور اگر وہ تصور اور قضیہ خود عالمِ خارج میں واقعہ بن جائے تو یہ علم تخلیقی ہے۔ علم میں تخلیق کا معنی یہ قرار پایا کہ تصور کو واقعہ بنایا جا سکے، غایت ومقصد کو بالفعل حاصل کیا جا سکے اور مطلوبہ نتائج کو حتماً پیدا کیا جا سکے۔ جو علم اپنے اندر مفروضہ و تصور کی واقعیت، غرض و غایت کے حصول اور مطلوبہ نتائج کے ترتب کی حتمی وقطعی ضمانت رکھتا ہے، وہ تخلیقی علم ہے اور اُسی کو علم یقینی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جو علم اپنے قضیہ وتصور کے واقعہ بننے، اپنے مقصد اور نصب العین کے حاصل ہونے اور اپنے دعوے کے مطابق نتائج پیدا ہونے

کی ضمانت نہیں دے سکتا، وہ جس قدر بھی تحقیق و مطالعہ پر مبنی ہو، سطحی ہے؛ اسے تخلیقی نہیں کہا جاسکتا۔ وہ علم اپنی تمام تر وسعتوں اور تفصیلات کے باوجود سطحی رہتا ہے۔

علم کو تخلیقی (creative) بنانے کے لیے اس کا نتیجہ خیز ہونا ضروری ہے اور نتیجہ خیزی کی حتمی ضمانت مہیا کیے بغیر کوئی بھی عالم اور مفکر تخلیقی علم کا حامل قرار نہیں پاسکتا۔

ارشاد باری تعالیٰ

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى○[1]

اور وہ (اپنی) خواہش سے کلام نہیں کرتے○ اُن کا ارشاد سَراسَر وحی ہوتا ہے جو انہیں کی جاتی ہے○

کے مطابق قرآن و حدیث کا علم وحیِ الٰہی کی دونوں صورتوں پر مشتمل ہے۔ یہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے تخلیقی بھی ہے اور یقینی بھی۔ قرآن اپنے عطا کردہ علم کی حیثیت کئی طرح واضح کرتا ہے۔ ارشاداتِ ربانی ملاحظہ ہوں:

۱. ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ○[2]

(یہ) وہ عظیم کتاب ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، (یہ) پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے○

۲۔ سورہ یوسف میں قرآنی علم کی ماہیت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ○[3]

(۱) النجم، ۵۳:۳-۴

(۲) البقرة، ۲:۲

(۳) یوسف، ۱۲:۱۱۱

بے شک ان کے قصوں میں سمجھ داروں کے لیے عبرت ہے، یہ (قرآن) ایسا کلام نہیں جو گھڑ لیا جائے بلکہ (یہ تو) ان (آسمانی کتابوں) کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے (نازل ہوئی) ہیں اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ہدایت ہے اور رحمت ہے، اس قوم کے لیے جو ایمان لے آئے ○

۳. هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ○ (۱)

یہ قرآن لوگوں کے لیے واضح بیان ہے اور ہدایت ہے اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہے ○

۴. وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ○ (۲)

اور ہم نے آپ پر وہ عظیم کتاب نازل فرمائی ہے جو ہر چیز کا بڑا واضح بیان ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے ○

۵. وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ○ (۳)

اور بے شک ہم ان کے پاس ایسی کتاب (قرآن) لائے جسے ہم نے (اپنے) علم (کی بنا) پر مفصّل (یعنی واضح) کیا، وہ ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے ○

۶. يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ

(۱) آل عمران، ۳:۱۳۸
(۲) النحل، ۱۶:۸۹
(۳) الأعراف، ۷:۵۲

وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ○[1]

اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور ان (بیماریوں) کی شفاء آ گئی ہے جو سینوں میں (پوشیدہ) ہیں اور ہدایت اور اہلِ ایمان کے لیے رحمت (بھی)○

۷. شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ○[2]

رمضان کا مہینہ (وہ ہے) جس میں قرآن اتارا گیا ہے جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور (جس میں) رہنمائی کرنے والی اور (حق و باطل میں) امتیاز کرنے والی واضح نشانیاں ہیں، پس تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پالے تو وہ اس کے روزے ضرور رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں (کے روزوں) سے گنتی پوری کرے، اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لیے دشواری نہیں چاہتا، اور اس لیے کہ تم گنتی پوری کر سکو اور اس لیے کہ اس نے تمہیں جو ہدایت فرمائی ہے اس پر اس کی بڑائی بیان کرو اور اس لیے کہ تم شکر گزار بن جاؤ○

۸. قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ○ يَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى

(۱) یونس، ۱۰:۵۷

(۲) البقرة، ۲:۱۸۵

صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ○[1]

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور (یعنی حضرت محمد ﷺ) آ گیا ہے اور ایک روشن کتاب (یعنی قرآن مجید)○ اللہ اس کے ذریعے ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے پیرو ہیں، سلامتی کی راہوں کی ہدایت فرماتا ہے اور انہیں اپنے حکم سے (کفر و جہالت کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان و ہدایت کی) روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور انہیں سیدھی راہ کی سمت ہدایت فرماتا ہے○

۹. فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ○[2]

پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو بھی میری ہدایت کی پیروی کرے گا، نہ ان پر کوئی خوف (طاری) ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے○

یہ اَمر اَظہر من الشّمس ہے کہ قرآنی علم کو ہر جگہ بلا اِستثنا ہدایت کہا گیا ہے اور ہدایت علم کی وہ صورت ہے جو مقصد و غایت کے شعور سے لے کر راہ دکھانے اور منزلِ مقصود تک پہنچانے کی ضمانت مہیا کرتی ہے۔ متکلمین کی اصطلاح میں ہدایت کی دو قسمیں ہیں:

۱ ۔ إِرَاءَةُ الطَّرِيْقِ (راستہ دکھانا)

۲ ۔ إِيْصَالٌ إِلَى الْمَطْلُوْب (مقصود و مطلوب تک پہنچا دینا)

پہلی قسم کی ہدایت صرف رہنمائی یعنی منزل کا راستہ دکھا دینے پر منحصر ہے۔ اس میں غایتِ کار تک پہنچ جانے کی ضمانت اس لیے موجود نہیں کہ کیا خبر انسان ایک مرتبہ راستہ پا کر پھر بھٹک جائے۔ یہ ہدایتِ عامہ ہے اور دوسری کے مقابلے میں ناقص بھی۔ جب کہ

(۱) المائدۃ، ۵:۱۵-۱۶

(۲) البقرۃ، ۲:۳۸

دوسری قسم منزلِ مقصود تک پہنچانے کی ضمانت کا نام ہے۔ اگر ایک شخص کسی کی رہنمائی میں اپنی مطلوبہ غایت پر پہنچ جائے تو پھر بھٹکنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ دوسری ہدایتِ خاصہ ہے اور پہلی کے مقابلے میں کامل بھی کیونکہ اس میں نتیجہ خیزی کی حتمی و قطعی ضمانت ہے۔

قرآنی علم ایسی ہدایت کا نام ہے جو نہ صرف مقصد اور نصب العین کا شعور مہیا کرتی ہے بلکہ منزل تک پہنچنے کا راستہ بتانے کے علاوہ وہاں تک پہنچانے کی حتمی ضمانت بھی مہیا کرتی ہے۔ اب اس کا اِنحصار ہر شخص کے کاسۂ طلب پر ہے کہ وہ قرآنی علم سے کیا طلب کرتا ہے: شعورِ مقصد، طریقِ منزل یا خود منزلِ مقصود (یا کچھ بھی نہیں)!

قرآنی علم کی اس حیثیت کو سمجھنے کے لیے اس قرآنی دعوے پر غور کرنا ضروری ہے:

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ○ (۱)

تاکہ اس (رسول ﷺ) کو ہر دین (والے) پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین کو برا لگے○

چنانچہ قرآنِ مجید کے طالب علموں پر یہ جستجو لازم ہے کہ وہ اس دعوے کی حتمیت اور قطعیت کی اَساس کو سمجھیں اور اس قرآنی دعوے کی حقانیت پر ایمان رکھنے والے اس وقت دنیا میں غلبۂ اَغیار کے مشاہدے کی توجیہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی علم کی بیان کردہ منزل قرآن ہی کے بیان کردہ راستے پر چل کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم قرآنی منزل کو حاصل کرنے کی آرزو اپنے اور صرف اپنے متعین کردہ راستوں پر چل کر کرتے پھرتے ہیں۔ یہ اَمر ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ اپنے مزعومہ مفادات کے تحت متعین کردہ راستوں پر قرآنی منزل کا سراغ نہیں مل سکتا۔

(۱) التوبة، ۹:۳۳

پس ثابت ہوا کہ قرآنی علم ہدایت ہونے کے اعتبار سے فی الحقیقت ایسا تخلیقی اور یقینی علم ہے جس میں مقصد اور نتائج کے حصول اور مطلوبہ تصورات کی عملی واقعیت کی قطعی ضمانت مہیا کی گئی ہے۔

اگر مذکورہ بالا آیات پر غور کیا جائے تو بلا تاویل وتعبیر قرآنی علم کی درج ذیل حیثیتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ **ہدایت:** تاریکی اور بے یقینی کی کیفیت سے نکال کر منزلِ مقصود تک حتماً پہنچا دینے کی ضمانت۔

۲۔ **تصدیق:** صحفِ ما قبل کی صحت اور ان کے علوم کی حقانیت کی فیصلہ کن ضمانت۔

۳۔ **تفصیل وتبیین:** موجودات و حقائق کے علم کے تمام گوشوں کی وضاحت اور تشکیک و اِلتباس کے خاتمے کی قطعی ضمانت۔

۴۔ **رحمت:** اپنے ماننے والوں کو انفرادی، اجتماعی اور عالمی سطح پر ہر قسم کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی اذیت سے نجات دلانے کی ضمانت۔

۵۔ **شفاء:** فرد اور معاشرے کو تمام باطنی اور خارجی امراض و مصائب سے کلی نجات کی ضمانت۔

۶۔ **موعظت:** تنبیہ، تنذیر اور تذکیر کی صورت میں نفسیاتی تحریک کے ذریعے شعورِ انسانی کے اندر حصولِ کمال کی طلب اور اس کی ضمانت۔

۷۔ **بشارت:** دنیا و آخرت میں حق و باطل اور خیر و شر کے تصادم میں حق کے غلبے اور کامیابی کی ضمانت۔

۸۔ **فرقان:** اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل کی صورت میں حق و باطل کے درمیان واضح امتیاز کی ضمانت۔

۹۔ مخرج من الخوف والحزن: منزل مقصود تک پہنچا کر ہر قسم کے خوف وغم سے بے نیاز کر دینے کی ضمانت۔

۱۰۔ روشن کتاب: واضح اور فیصلہ کن تحریر کی صورت میں غلبۂ حق کی جد و جہد کے تمام مراحل کے لیے جملہ تفصیلات کی فراہمی اور ان کی قطعی نتیجہ خیزی کی ضمانت۔

گویا قرآنی علم اپنی ہر حیثیت میں واضح طور پر فیصلہ کن اور نتیجہ خیز ہے اور یہی خوبی اس کے تخلیقی ہونے کی اساس ہے۔

اسی موضوع کو ایک اور جہت سے دیکھا جائے تو یہ اَمر طے پاتا ہے کہ محض قضیہ وتصور علم کہلاتا ہے اور اس تصور کا واقعہ ہو جانا عمل۔ اگر انسانی فکر صرف علم کے درجے تک رہے تو اس میں سطحیت رہتی ہے اور عمل کے درجے تک پہنچ جائے تو اسے تخلیق قرار دیتے ہیں۔

علم اور عمل میں فرق

علم کا موضوع محض کسی حقیقت کو جاننا ہے، جب کہ عمل کا موضوع مقصود کو حاصل کرنا ہے۔

- علم کی اِبتداء شک سے ہوتی ہے اور عمل کی اِبتداء یقین ہے۔
- علم میں فکر کو اَہمیت حاصل ہے اور عمل میں عزم و اِرادہ کو۔
- علم کا تعلق توجیہ سے ہے اور عمل کا تخلیق سے۔

توجیہی اور تخلیقی علم میں فرق

عصرِ حاضر کے بیشتر زعماء و مفکرین نے جس میدان میں بھی علم و فکر مہیا کیا ہے، وہ صرف توجیہی نوعیت کا ہے اور توجیہ مطلقاً تین چیزوں سے بحث کرتی ہے:

۱۔ تجزیہ و تحلیل (analysis): کسی شے کے اَجزاے ترکیبی کا معلوم کرنا۔

۲۔ تنظیم (organisation): ماہیت اور ہیئتِ قضائیہ کا منظّم مدلول کی صورت میں جاننا۔

۳۔ تعلیل (causation): علت اور مقصد و غایت کو دریافت کرنا۔

یہ اَمر قابلِ صد افسوس ہے اور لمحۂ فکریہ بھی کہ آج کا فکر بالعموم ان توجیہی تقاضوں کو بھی کم ہی پورا کرتا ہے۔ مختلف موضوعات پر سیکڑوں کتب تصنیف کی جاتی ہیں، صفحات کے صفحات رقم کیے جاتے ہیں، لیکن ان مفکرین اور مصنفین کی علمی سطحیت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ صرف توجیہی علم کی ضروریات بھی پوری نہیں ہو پاتیں۔ حالانکہ محض ان تقاضوں کو پورا کرنے سے بھی علم سطحی ہی رہتا ہے، تخلیقی نہیں ہوسکتا۔ جب تک وہ توجیہ کے تینوں مدارج سے گزر کر اس اَمر سے بحث نہ کر لے کہ مقصد و غایت کو حتمی طور پر کس طرح حاصل کیا جائے، علم تخلیق کی صفت سے بہرور نہیں ہوسکتا۔

۱۔ توجیہ تک محدود سطحی علم اَخلاق کی ماہیت اور معیارِ اَخلاق سے بحث کرتا ہے۔ لیکن تخلیقی علم اِس اَمر سے بحث کرتا ہے کہ انسانی زندگی مطلوبہ معیارِ اخلاق میں کس طرح ڈھل سکتی ہے۔ گویا سطحی علم فضائلِ اَخلاق اور اَخلاقی نصب العین کی ماہیت جاننے تک محدود ہے مگر تخلیقی علم ان کے حصول کے طریق سے بحث کرتا ہے۔

۲۔ سطحی یا توجیہی علم جمالیات سے اس طرح بحث کرتا ہے کہ معیارِ حُسن کیا ہے؟ اس کی صحت کی منطقی اساس کیا ہے؟ لیکن تخلیقی علم اِس اَمر سے بحث کرتا ہے کہ جمالیاتی نصب العین میسر کیسے آ سکتا ہے؟

۳۔ سطحی و توجیہی علم عمرانیات میں اس سے بحث کرتا ہے کہ معاشرہ کیا ہے؟ کیونکر وجود میں آتا ہے؟ اور اس کے اِنضباط و اِختلال کے اَسباب کیا ہیں؟ مگر تخلیقی علم اِس اَمر سے بحث کرتا ہے کہ ہر اِختلال کو رفع کر کے ہیئتِ عمرانی کو ایک مؤثر وحدت میں کیسے بدلا جا سکتا ہے؟

۴۔ سطحی و توجیہی علم سیاسیات میں اِس سے بحث کرتا ہے کہ ریاست کیا ہے؟ اس کی ماہیئت، اَجزاے ترکیبی اور وظیفہ کیا ہے؟ لیکن تخلیقی علم اِس اَمر سے بحث کرتا ہے کہ حاکم و محکوم میں سیاسی تناقض (جو عدمِ اِستحکام کا باعث ہوتا ہے) رفع کر کے قومی نصب العین کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ سطحی و توجیہی علم معاشیات میں اس سے بحث کرتا ہے کہ معاشی تخلیق کا عمل کیا ہے؟ دولت کی تخلیق، تقسیم اور صرف کا عمل کیسے واقع ہوتا ہے؟ لیکن تخلیقی علم اِس اَمر سے بحث کرتا ہے کہ معاشی تخلیق کو مزعومہ مفادات سے پاک کر کے وسائلِ تخلیق پر قابض محدود گروہوں کی اِجارہ داری ختم کرنے اور فرد اور معاشرے کی تخلیقی جد و جہد سے معاشی تعطل کو رفع کرنے کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں کہ کوئی شخص حاجت مند نہ رہے۔

۶۔ سطحی و توجیہی علم مذہبیات میں اس سے بحث کرتا ہے کہ عقائدِ اسلام کیا ہیں؟ اعمالِ شرعی کیا ہیں؟ پسندیدہ اور ناپسندیدہ عقائد و اَعمال میں امتیاز کیا ہے؟ لیکن تخلیقی علم اِس اَمر سے بحث کرتا ہے کہ اگر عقائد اَوہام (myths) میں بدل چکے ہوں، اَعمال مردہ رسوم میں تبدیل ہو چکے ہوں اور ان کے مابین کوئی عملی اور مؤثر تعلق باقی نہ رہا ہو تو انہیں پھر کس طرح سے زندہ کیا جائے کہ عقیدہ و عمل کا تعلق بحال ہو کر زندگی میں اِنقلاب بپا کر سکے۔ لیکن اَفسوس ہے کہ آج مفکرین اپنے دور میں فکری و نظریاتی اِمامت کا دعویٰ کر کے بھی ہر مسئلے پر تخلیقی فکر مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔

گویا تمام دائرہ ہاے تحقیق میں انسانی علم آج توجیہ کی حدود سے باہر نہیں نکل سکا اور علماء و مفکرین کا پورا فکر ایجاد و تخلیق سے عاری ہو کر رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلیمی و تحقیقی مراکز پوری کوشش کے باوجود عملی زندگی کے مسائل کا حل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

علماء کا طرزِ فکر

علماء کا اندازِ فکر یہ ہوگیا ہے کہ مسئلہ کیا ہے؟ حالانکہ محض اتنی بات معلوم کر لینے سے مقصود حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک سوچ کا انداز یہ نہ ہو کہ مسئلے کا حل کیا ہے؟ پہلا انداز سطحی و توجیہی ہے جبکہ دوسرا تخلیقی و ایجادی، لیکن اس سے بھی زیادہ پریشان کن صورت حال یہ ہے کہ اکثر اہلِ علم اس توجیہی علم و تحقیق کی ڈگر پر چل کر اب تک مسئلے کو بھی معلوم نہیں کر سکے، اس کے حل کی طرف متوجہ ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔ اگر ہم اپنے مدارس و مکاتب کے نصاب ہائے تعلیم پر نظر ڈالیں تو وہ بھی بلا اِمتیاز تخلیقی صفت سے - إلا ما شاء الله - یک سر عاری ہیں۔ اسی وجہ سے اقبال شکوہ کناں ہیں:

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

توجیہی و تخلیقی علم کے امتیاز سے یہ واضح ہو گیا کہ علم کے تخلیقی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ عمل کے سانچے میں ڈھل کر مطلوبہ نتائج کے حصول کی ضمانت عطا کر دے، ایسا علم تجربی توثیق (experimental verification) کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر علم کی صحت و عدم صحت کو پرکھنے کے لیے تجربی توثیق کے تنقیدی اصول کو تسلیم کر لیا جائے اور اسی کی بنیاد پر زُعماء و مفکرین کے مفروضے، قضیے، اَفکار و خیالات اور تعلیمات و نظریات قبول یا ردّ کیے جائیں تو علم آج بھی صفتِ تخلیق سے بہرہ ور ہوسکتا ہے لیکن ہمارے ہاں تو نقطۂ نظر یہ ہوگیا ہے کہ ہر مفکر اپنی رائے اور تحقیق کو اسی طرح حتمی و قطعی تصور کرتا ہے کہ اسے تنقیدی منہاج پر پرکھنے کی اجازت نہیں دینا چاہتا۔ دوسروں سے اِختلاف کا حق سلب کرتے ہوئے اُسے منزل من اللہ حکم کی طرح حرفِ آخر سمجھتا ہے۔

اگر اس علم، تصور یا theory سے سماج میں مطلوبہ تبدیلی پیدا نہ ہو اور وہ عملی نتائج کی کسوٹی پر پورا نہ اترے تو اپنے فکر پر نظر ثانی کرنے کے بجائے یہ کہہ کر اپنی علمی

خطا پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے کہ علم کی صحت و عدم صحت کے لیے حصولِ نتائج کی ضمانت کا اصول خلافِ اِسلام ہے۔ نتائج کے پیدا ہونے کی ضمانت (معاذ اللہ) علومِ اسلامی کا حصہ نہیں۔ آپ جد و جہد کریں مگر نتائج کے اعتبار سے کام یابی یا ناکامی ہمارے ذمہ نہیں۔ اصل کام یابی اُخروی کام یابی ہے۔

یہ ہے وہ تصور جس پر آج علمی و مذہبی قیادت اکتفا کیے ہوئے ہے۔ یہاں تک کہ بعض مفکرین نے اپنے کھوکھلے اور محض سطحی فکر کا مصنوعی بھرم رکھنے کے لیے بعض انبیاء کرام ﷺ پر ان کی تبلیغی و تعلیمی مساعی میں (معاذ اللہ) ظاہری شکست اور ناکامی کا الزام بھی عائد کر دیا ہے۔ انبیاء ﷺ کے نفوسِ قدسیہ پر علم بالوحی کے حامل ہونے کے باوجود نتائج سے ناکامی کا بے بنیاد الزام صرف اس غرض سے عائد کیا گیا تاکہ اپنے سقیم اور غیر مؤثر علمی و فکری سرمائے کی بے تاثیری پر پردہ رہ سکے اور لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ اگر انبیاء ﷺ علوم نبوت کے باوجود مطلوبہ نتائج (معاذ اللہ) پیدا نہیں کر سکے تو دیگر انسانوں کی فکری و نظریاتی کاوشیں کیونکر حتماً نتیجہ خیز ہوسکتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ گروہ انبیاء ﷺ میں سے کوئی فرد بھی آج تک اپنی تبلیغی و تعلیمی مساعی میں مطلوبہ نتائج کے اعتبار سے ناکام نہیں ہوا اور نہ ہوسکتا تھا کیونکہ اس سے نہ صرف صحتِ نبوت بلکہ دعویٰ توحید بھی مجروح ہوسکتا تھا۔ بنی اسرائیل کے چند انبیاء کرام ﷺ کے ذکر سے جن لوگوں کو التباس ہوا ہے، وہ درحقیقت قرآن کے سیاق و سباق کے حوالے سے پوری تفصیلات سمجھ نہیں سکے۔ ورنہ ایسی غلط فہمی ہرگز پیدا نہ ہوتی۔ (یہ ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے جس پر یہاں روشنی نہیں ڈالی جا سکتی؛ اس کے لیے ہماری کتاب 'مقصد بعثت اَنبیاء ﷺ' کا مطالعہ فرمائیں۔)

مختصر یہ کہ انبیاء ﷺ کے ان دعووں کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھیں جو ان کے حوالے سے خود قرآن نے بیان کیے ہیں اور جو انہوں نے اپنی تبلیغی جد و جہد کے آغاز میں مخالفین کے سامنے بطورِ تحدی بیان کیے تھے تو وہ صریحاً کام یابی و کامرانی سے ہم کنار ہوئے اور

جن مثبت و منفی نتائج کا اعلان ان انبیاء ﷺ نے اپنے موافق و مخالف گروہوں کے حق میں کیا تھا، بالآخر وہ پیدا ہو کر رہے اور وہ دعوے انہی انبیاء ﷺ کی ظاہری زندگیوں میں واقع بن گئے، جن سے علوم اور دعاوی کی صحت و حقانیت تجربی توثیق کی بناء پر آشکارا ہوگئی۔ خود قرآن ان زندہ حقیقتوں کا ذکر متعدد مقامات پر کرتا ہے۔ انہیں سمجھنے کے لیے بصیرت پر مبنی مطالعہ قرآن کی ضرورت ہے۔

اُخروی کامیابی کے اصل کام یابی ہونے کا تصور تو ہمارے عقیدہ و ایمان کی روح ہے، اس سے اختلاف نہیں ہوسکتا لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام اگر دنیا و آخرت دونوں زندگیوں کا دین ہے، جیسا کہ ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ (اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں (بھی) بھلائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) بھلائی سے نواز)[1] میں مذکور ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس دنیا میں علم عقیدے کے طور پر ہی محفوظ رہے اور یہاں نتائج کے حصول میں ناکام رہے؛ جب کہ سائنس کا ہر دعویٰ laboratory test کے ذریعے اپنی صحت و حقانیت کا اعلان کر رہا ہے! جب تاریخ کا ہر اصول تاریخی ریکارڈ و شواہد کے ذریعے اپنی قبولیت کی پیشکش کرتا ہے اور غیر مسلم مفکرین بالخصوص اِشتراکی اساطین اپنے نظریے کی صحت اِنسانی سماج کی تجربہ گاہ کے نتائج سے منوانے کا دعویٰ کر رہے ہیں تو آج کا مذہبی ذہن اپنے علوم و معتقدات کو تجربی توثیق کی کسوٹی پر پرکھنے سے کیوں گھبراتا ہے؟ وہ مشاہداتی نتائج کے تنقیدی منہاج سے کیوں گریز کرتا ہے؟

کیا خدا اور رسول ﷺ کے دعوے (معاذ اللہ) اس قدر کمزور ہیں کہ وہ حصول نتائج کی ضمانت نہیں دے سکتے، یا اسلامی تعلیمات کے نام سے زعماء کا ذہنی تراشیدہ فکر اس قدر سقیم ہے کہ وہ تجربات کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا؟ پہلی بات تو یقیناً نہیں ہوسکتی کیونکہ قرآن ہر دعوے پر حصول نتائج کی ضمانت دیتا ہے:

---

(۱) البقرة، ۲: ۲۰۱

۱. وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَo[۱]

اور تم ہمت نہ ہارو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب آؤ گے اگر تم (کامل) ایمان رکھتے ہوo

۲. فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْo[۲]

(اے مومنو!) پس تم ہمت نہ ہارو اور ان (متحارب کافروں) سے صلح کی درخواست نہ کرو (کہیں تمہاری کمزوری ظاہر نہ ہو)، اور تم ہی غالب رہو گے، اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال (کا ثواب) ہرگز کم نہ کرے گاo

۳. لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَo[۳]

تاکہ اسے سب ادیان پر غالب و سربلند کر دے خواہ مشرک کتنا ہی ناپسند کریںo

اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہ ارشادات اِس اَمر کی ناطق شہادتیں ہیں۔ اِسی اِعلان کے مطابق اگر قرآنی ہدایت نے ماضی میں فرد اور جماعت کو اپنی اپنی منزل و غایت تک پہنچایا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آج وہ تاثیر اور نتیجہ خیزی باقی نہ رہے۔ صرف تجربی توثیق کے ذریعے ان علوم کو توجیہ سے تخلیق تک لے جانا درکار ہے۔

دراصل صورتِ حال یہ ہے کہ نہ ہم اپنی فکر کی سطحیت یا اس کی سہو و خطا کو تسلیم کرنا چاہتے ہیں، نہ تجرباتی توثیق (experimental verification) کو بطورِ اُصول تسلیم کر کے اپنی نام نہاد فکری و علمی اجارہ داریوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس صورتِ حال کو

(۱) آل عمران، ۳:۱۳۹

(۲) محمد، ۴۷:۳۵

(۳) الصف، ۶۱:۱۱

قائم رکھ کر ہم اسلام کے خلاف باطل اَفکار و نظریات کی یلغار کو نہیں روک سکتے اور نہ گونا گوں پریشان کن مسائل میں الجھے ہوئے انسانوں کو سکون و اطمینان دے سکتے ہیں۔ اگر اندازِ فکر یہی رہا اور اسے تنقیدی اُصول کی بنیاد پر تخلیقی نہ بنایا گیا تو اسلام کے خلاف ایک نظریاتی نفرت جنم لے گی (جس کا آغاز بھی ہو چکا ہے) اور اس کا انسداد بذاتِ خود انتہائی مشکل مسئلہ بن جائے گا۔

تخلیقی علم کی شرائط و خصوصیات

اگر ہم علم کو سطحیت اور محض توجیہ کے درجے سے اٹھا کر تخلیق کے مقام پر فائز کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ علوم اور تعلیمی نصابات درج ذیل علمی شرائط پر پورے اتریں۔ یہی شرائط دراصل تخلیقی علم کی خصوصیات ہیں:

۱۔ کلی (Inclusive/Comprehensive)

علم کے کلی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے تمام متعلقات اور متفرعات میں ایک ہی اصول کارفرما ہو اور علم کے تمام نتائج میں ہم آہنگی، یکسانیت اور وحدت پائی جائے۔ اس طرح علم اپنے دائرۂ اطلاق (scope of application) کے لحاظ سے کلی یعنی جامع اور مانع ہوتا کہ کثرتِ نتائج سے پاک رہے اور تمام متعلقہ مسائل (relevant issues) اصلِ واحد سے متفرع کیے جا سکیں۔

۲۔ مثبت (positive/optimistic)

علم کے مثبت ہونے سے مراد یہ ہے کہ علم ایسے منفی تصورات سے پاک ہو جو زندگی کو یاس و نا اُمیدی کا شکار کر دیتے ہیں بلکہ علم اپنی اِثباتیت کے اعتبار سے زندگی کو ہر مرحلے پر سہارا عطا کر سکے۔

۳۔ عملی (practical/pragmatic)

علم کے عملی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ محض منطقی اور فلسفیانہ تصورات کی طرح عملی حیثیت سے خالی نہ ہو بلکہ عملاً قابلِ قبول ہو تاکہ اس کے لیے جد و جہد کی ترغیب پیدا ہو سکے۔

۴۔ ولولہ انگیز (instigating/provocative)

علم کے ولولہ انگیز ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس سے انسانی دلوں میں اسی قدر شدت کے ساتھ ولولہ اور جوش پیدا ہو سکے جس قدر اسے واقعہ بنانے کے لیے ضروری ہے یعنی وہ علم نہ صرف خود زندہ ہو بلکہ دوسروں کو بھی زندہ رکھ سکے۔

۵۔ نتیجہ خیز (decisive/conclusive)

علم کے نتیجہ خیز ہونے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے مطلوبہ نتائج حتمی و قطعی طور پر پیدا ہو کر رہیں۔ یہی امر اس کی حقانیت کی اصل دلیل قرار پائے اور اسے اپنے جواز یا صحت کے ثبوت کے لیے غیر عملی منطقی دلائل پر انحصار نہ کرنا پڑے۔

فی الواقع یہ وہ شرائط اور خصوصیات ہیں جو تخلیقی علم کو سطحی و توجیہی علم سے ممیّز کرتی ہیں اور ہمارا موجودہ علمی و فکری سرمایہ ان خصائص سے یکسر محروم ہے۔ لہٰذا ہمارے علماء و مفکرین اور بالخصوص تعلیمی نصابوں کے مدوّنین اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوں کہ ہماری مذہبی اور دینی تعلیم کے نصابات ایسے علوم و مسلمات پر مشتمل ہونے چاہییں جو مذکورہ بالا شرائط کے مطابق تخلیقی ہوں، محض توجیہی نہ ہوں۔ طلبہ و اساتذہ علوم کی صحت و عدم صحت کے لیے تجربی توثیق کے تنقیدی اُصول کو اپنائیں تاکہ رفتہ رفتہ ہمارا نصابِ تعلیم مردہ، غیر تخلیقی اور بے سود اَفکار و علوم کے اَنبار سے پاک ہوتا جائے اور اس کی جگہ زندہ، تخلیقی اور سود مند علوم و اَفکار رائج ہو سکیں۔ صرف اس چیلنج کو قبول کر کے ہی ہم اپنی تعلیمی و فکری

زندگی کا جمود و تعطل رفع کر سکتے ہیں۔ یہ انقلابی قدم صرف خدا و رسول ﷺ اور دینِ حق سے صحیح طور پر مخلصانہ وفاداری اور اپنے مزعومہ مفادات اور مصنوعی اجارہ داریوں سے توبہ کیے بغیر نہیں اٹھایا جا سکتا۔

حواشی

۱ حواس

حِس کی جمع ہے اور اس کا معنی علماء نے یہ بیان کیا ہے:

الْحَاسَّةُ: الْقُوَّةُ الَّتِي بِهَا تُدْرَكُ الْأَعْرَاضُ الْحِسِّيَّةُ. (۱)

حس ایسی قوت ہے جس سے موجوداتِ حسیہ کا ادراک ہوتا ہے۔

حواس سے مراد حواسِ خمسہ ظاہری (سامعہ، باصرہ، شامہ، ذائقہ اور لامسہ) ہیں۔ ان کے ذریعے محسوسات کا محض ادراک (perception) ہوتا ہے جسے علم (knowledge) نہیں بلکہ علم کا خام مواد تصور کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ بالا حواسِ خمسہ سے کسی بھی حس کا عمل جب تک عقل سے باقاعدہ تعلق پیدا نہ کرے، اِدراک تک محدود رہتا ہے اور علم قرار نہیں پا سکتا۔ اسی وجہ سے حسیت (۲) کا نقطہ نظر ردّ کر دیا گیا کیونکہ حقائق - جنہیں جاننا درکار ہے - صرف محسوسات تک محدود نہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی بے شمار حقائق موجود ہیں۔ جو موضوعِ علم ہیں۔ مزید برآں صرف حواس کے ذریعے ان مدرکاتِ حسی کا بھی کامل علم حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ عقل کے بغیر حواس حصولِ علم کا کامل ذریعہ نہیں ہیں۔ چنانچہ فلاسفہ و متکلمین حواس کے ادراکات کو علم کے مبادی اور مقدمات کا درجہ دیتے ہیں لیکن حواس کی اس ناکافی اور غیر کامل حیثیت کے باوجود اِستعدادِ صلاحیت، ضرورت اور اِفادیت کا انکار ناممکن ہے۔ قرآنِ حکیم خود اس امر کی تصدیق کرتا ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ. (۳)

(۱) راغب اصفہانی، المفردات: ۱۱۶

(۲) فلاسفہ یونان میں سے ایک طبقے کا یہ نظریہ تھا کہ حواس اور محض حواس ہی ذریعۂ علمِ حقیقت ہیں۔

(۳) آل عمران، ۳: ۵۲

پھر جب عیسیٰ (ﷺ) نے ان کا کفر محسوس کیا تو اس نے کہا: اللہ کی طرف کون لوگ میرے مددگار ہیں؟

ایک اور مقام پر ملاحظہ ہو:

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ[1]

پھر جب انہوں نے ہمارے عذاب (کی آمد) کو محسوس کیا تو وہ وہاں سے تیزی کے ساتھ بھاگنے لگے ○

۲۔ عقل

اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

اَلْعَقْلُ: وَهُوَ قُوَّةٌ لِلنَّفْسِ، بِهَا تَسْتَعِدُّ لِلْعُلُوْمِ وَالْإِدْرَاكَاتِ.[2]

عقل ایسی نفسی قوت ہے جس کے ذریعے آپ علوم و ادراک حاصل کرنے کے لیے مستعد ہوتے ہیں۔

گویا عقل نفسِ انسانی کی ایسی قوت متہیئہ ہے جو مختلف اِدراکات (perceptions) اور ان کے مدلولات (implications) کو قبول کرتی ہے اور انہیں مرتب و محفوظ صورت میں لا کر علم کا درجہ دیتی ہے۔

عقل بھی تشکیلِ علم کے سلسلے میں پنج گانہ فرائض ادا کرتی ہے اور ان پانچ فرائض کا تعلق عقل کے پانچ مختلف شعبوں سے ہے، جنہیں خواسِ خمسہ باطنی سے تعبیر کیا جاتا ہے: حسِ مشترکہ، حسِ متوہمہ، حسِ متخیلہ، حسِ متصرفہ اور حسِ حافظہ۔ حواس سے حاصل شدہ ادراکات عقل تک پہنچتے ہیں، پھر عقل ہر ایک اِدراک اور اس کے مدلول کو مذکورہ بالا

(۱) الأنبياء، ۲۱: ۱۲

(۲) تفتازانی، شرح العقائد النسفية: ۲۰

پانچ شعبوں کے باہمی تعامل و تعاون سے مرتب و منظّم کر دیتی ہے اور اس طرح ادراک علم کے درجہ پر پہنچتا ہے۔ ورنہ محض سامعہ - جو ایک حسِ ظاہری ہے - سے آواز کو سنا تو جا سکتا ہے، اس کے معنی و مفہوم کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ محض باصرہ سے کسی مادّی وجود کو دیکھا تو جا سکتا ہے مگر نہ اس کا تشخص اور تعین ہو سکتا ہے، نہ اس کے حسن و قبح میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ محض شامہ سے بو کو سونگھا تو جا سکتا ہے لیکن خوشبو، بدبو اور ان کے مراتب میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ محض ذائقہ سے کسی شے کو چکھا تو جا سکتا ہے لیکن اس کی نسبت خوش ذائقہ یا بد ذائقہ ہونے کا فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح لامسہ سے کسی وجود کو مس تو کیا جا سکتا ہے لیکن کیفیاتِ لمس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کیونکہ جملہ حواسِ ظاہری کا اِدراک اسی حد تک ہے کہ وہ شعور قوتِ ممیّزہ اور قوتِ فیصلہ سے محروم ہیں۔ گویا وہ مدرکاتِ حسی کو محسوس تو کر سکتے ہیں، معلوم نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے حواسِ ظاہری نتائج کی خاطر سراسر عقل کے محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اَمر بھی غور طلب ہے کہ عقل بھی تشکیلِ علم میں کلیتًا حواس کی محتاج ہے، اگر حواس کے ذریعے اسے اِدراکات (یعنی علم کے مبادی و مقدمات) میسر نہ آئیں تو عقل محض بے بس اور بے کار آلہ کار بن کر رہ جاتی ہے۔ اگر آنکھ دیکھ نہ سکے تو عقل پہچان سے عاری رہے گی، کان سن نہ سکیں تو عقل فیصلہ نہیں کر سکتی، زبان چکھ نہ سکے تو عقل ذائقے کو سمجھ تک نہیں سکتی، ناک سونگھ نہ سکے تو عقل بو کے تصور تک سے نابلد ہے اور ہاتھ چھو نہ سکیں تو عقل لمس کی کیفیات سے محروم ہے۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ عقل کا حیطۂ عمل یہ ہے کہ وہ محض محسوسات ہی کو معقولات میں بدلتی ہے، اگر محسوسات نہ ہوں تو عقل کسی بھی علم کو ترتیب نہیں دے سکتی۔ چنانچہ عقل کی اس بے بسی کے باوجود اسے باقاعدہ اور مستند ذریعہ علم کا درجہ دیا جاتا ہے؛ جبکہ فلاسفہ یونان کا ایک طبقہ - جو عقلیت کا نقطہ نظر رکھتا تھا - کا موقف یہ تھا کہ عقل اور محض عقل ہی ذریعہ علمِ حقیقت ہے۔ وہ لوگ اپنا دعویٰ اسی نقصِ علم کی وجہ سے ثابت نہ کر سکے اور بالآخر یونانی فلسفہ تشکیک کا شکار ہو گیا۔

عقل کے ذریعۂ علم ہونے پر بھی قرآن شاہد و عادل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

۱۔ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ(۱)

اللہ کا کلام (تورات) سنتے پھر اسے سمجھنے کے بعد (خود) بدل دیتے حالاں کہ وہ خوب جانتے تھے (کہ حقیقت کیا ہے اور وہ کیا کر رہے ہیں)۔

۲۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ(۲)

اور کہیں گے: اگر ہم (حق کو) سنتے یا سمجھتے ہوتے تو ہم (آج) اہلِ جہنم میں (شامل) نہ ہوتے۔

۳۔ حواس اور عقل کے باہمی تعلق کے حوالے سے ارشاد رب العزت ہے:

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ(۳)

یہ لوگ بہرے، گونگے، اندھے ہیں سو انہیں کوئی سمجھ نہیں۔

۳۔ وجدان

یہ بھی انسان کی ایک نفسی اِستعداد ہے جس سے عالم طبیعات کے تمام حقائق - خواہ حسی ہوں یا عقلی، مادّی ہوں یا غیر مادّی، زمانی ہوں یا مکانی - کا ادراک اور معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس استعداد کی صحیح نشو ونما اور فروغ تزکیہ وتصفیۂ نفس سے ممکن ہے۔ وجدان (intuition) جسے عام طور پر چھٹی حس کے نام سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، ہر شخص

(۱) البقرة، ۲:۷۵

(۲) الملك، ۶۷:۱۰

(۳) البقرة، ۲:۱۷۱

کے اندر بلا امتیاز بالقوۃ (potential) حیثیت میں موجود ہوتا ہے، جس کا بالعموم احساس بھی نہیں ہوتا لیکن اس کی حقیقی افادیت (actual utility) کے لیے تزکیۂ نفس کی مختلف محنتوں، ریاضتوں کے ذریعے نفسیاتی حجابات کو مرتفع کرنا پڑتا ہے۔ حجابات اٹھتے ہی جلاءِ باطن نصیب ہو جاتی ہے اور وجدان (intuition) کشف کی صورت میں ایک مؤثر ذریعۂ علم حقیقت کے طور پر منصۂ شہود پر آ جاتا ہے۔ اس کے ذریعے وہ طبعی و غیر طبعی حقائق جن کا اِدراک اور علم حواس یا عقل کے ذریعے نہ ہو سکا تھا، منکشف ہونے لگتے ہیں۔ اسی کے متعلق حجۃ الاسلام امام غزالی رقم طراز ہیں:

وَرَآءُ الْعَقْلِ طُوَرٌ آخَرُ، تَفْتَحُ فِيْهِ عَيْنٌ أُخْرٰى، يُبْصَرُ بِهَا الْغَيْبُ، وَمَا سَيَكُوْنُ فِي الْمُسْتَقْبَلِ، وَأُمُوْرٌ آخَرُ الْعَقْلُ مَعْزُوْلٌ بِهَا.(۱)

اور عقل کے بعد ایک اور راستہ ہے جس میں دوسری (باطنی) آنکھ کھل جاتی ہے اس کے ذریعے غیب کا ادراک ہونے لگتا ہے۔ علاوہ ازیں مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات اور دیگر ایسے اُمور بھی جنہیں جاننے سے عقل قاصر ہوتی ہے، نظر آنے لگتے ہیں۔

یہی وجدان وہ قوتِ باطنی ہے جس کے بالفعل زندہ ہو جانے سے آئینۂ قلب روشن ہو جاتا ہے جس کے ذریعے حقائقِ کائنات آشکار ہو جاتے ہیں۔ امام محمد بن سعید المروزی کا قول ہے:

إِذَا طَلَبْتَ اللهَ بِالصِّدْقِ آتَاكَ اللهُ تَعَالٰى مِرْآةً بِيَدِكَ حَتّٰى تُبْصِرَ كُلَّ شَيْءٍ مِنْ عَجَائِبِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ.(۲)

(۱) غزالی، المنقذ من الضلال: ۵۴

(۲) ۱۔ قشیری، الرسالۃ: ۲۱۴

۲۔ غزالی، إحیاء علوم الدین، ۴: ۳۷۸

اے انسان! اگر تو خدا کو صدق دل سے طلب کرے گا تو اللہ تعالی کی طرف سے تجھے آئینۂ قلب عطا ہوگا جس میں تو دنیا و آخرت کے تمام عجائبات کا مشاہدہ کیا کرے گا۔

امام غزالی اسی اِستعداد کو ذوق سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فَأَمَّا الذَّوْقُ: فَهُوَ كَالْمُشَاهَدَةِ، وَالْأَخْذُ بِالْيَدِ، وَلَا يُوْجَدُ إِلَّا فِي طَرِيْقِ الصُّوْفِيَّةِ.(۱)

پس ذوق، مشاہدہ کی مانند اور ہاتھ سے کسی شے کو پکڑنے کی طرح ہے مگر یہ صلاحیت صرف طریقۂ صوفیاء سے حاصل ہوسکتی ہے۔

کیونکہ اس کا تحقق اور ارتقاء حواس اور عقل سے نہیں بلکہ ذوق اور محبت سے ہوتا ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال کہتے ہیں:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

اقبال کے نزدیک منزل شہود ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

کمال زندگی دیدارِ ذات است
طریقش رُستن از بندِ جہات است

اسی مضمون کو وہ اس طرح بھی بیان کرتے ہیں:

شہود کیسے ہو حاصل اس زمانے میں
وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

علامہ اقبال عقل و وجدان کا تقابل بوعلی اور رومی کی اصطلاحات میں کرتے

(۱) غزالی، المنقذ من الضلال:۵۹

ہوئے کہتے ہیں:

بو علی اندر غُبارِ ناقه گم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

الغرض اس استعداد کے اُجاگر ہو جانے کو بعض صوفیاء 'لطائف' حاصل ہو جانے سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ لطائف بھی حواس و عقل کے شعبوں کی طرح پانچ ہی ہیں: لطیفۂ قلب، لطیفۂ روح، لطیفۂ سر، لطیفۂ خفی اور لطیفۂ اخفی۔ چنانچہ قرآن مجید اسی حقیقت کی تائید میں حواس اور عقل کے علاوہ دل کو بھی ذریعۂ علمِ حقیقت سے تعبیر کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

۱. اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ○[1]

بے شک کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے باز پرس ہوگی○

۲. وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ.[2]

اور اس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔

۳۔ ایک اور مقام پر ملاحظہ ہو:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى○[3]

(اُن کے) دل نے اُس کے خلاف نہیں جانا جو (اُن کی) آنکھوں نے دیکھا○

۴۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مزید فرمایا:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ

(۱) الإسراء، ۱۷:۳۶
(۲) النحل، ۱۶:۷۸
(۳) النجم، ۵۳:۱۱

شَهِيْدٌ○[1]

بے شک اس میں یقیناً اِنتباہ اور تذکّر ہے اس شخص کے لیے جو صاحبِ دل ہے (یعنی غفلت سے دوری اور قلبی بیداری رکھتا ہے) یا کان لگا کر سُنتا ہے (یعنی توجہ کو یکسو اور غیر سے منقطع رکھتا ہے) اور وہ (باطنی) مشاہدہ میں ہے (یعنی حسن و جمالِ الوہیّت کی تجلّیات میں گم رہتا ہے)○

جو علم حواس و عقل کے احاطے سے ماورا ہو اور اس کا حصول صرف قلبِ سلیم کو کشف و وجدان کے ذریعے سے ہوا ہو، اُسے علم لدنی کہتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں اس کی وضاحت ملاحظہ ہو۔ حضرت خضر علیہ السلام کے سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا○[2]

تو دونوں نے (وہاں) ہمارے بندوں میں سے ایک (خاص) بندے (خضر علیہ السلام) کو پا لیا جسے ہم نے اپنی بارگاہ سے (خصوصی) رحمت عطا کی تھی اور ہم نے اسے علمِ لدنی (یعنی اَسرار و معارف کا اِلہامی علم) سکھایا تھا○

اس سلسلے میں امام حسن بصریؒ سے ایک حدیث مروی ہے:

الْعِلْمُ عِلْمَانِ: فَعِلْمٌ فِي الْقَلْبِ فَذٰلِكَ الْعِلْمُ النَّافِعُ، وَعِلْمٌ عَلَى اللِّسَانِ فَذٰلِكَ حُجَّةُ اللهِ عَلَى ابْنِ آدَمَ. [3]

علم دو قسم کا ہوتا ہے: ایک دل کا علم (علم لدنی) پس یہی نفع بخش علم ہے؛ دوسرا

(۱) ق، ۵۰:۳۷

(۲) الکہف، ۱۸:۶۵

(۳) ۱۔ دارمی، السنن، ۱:۱۱۴، رقم:۳۶۴

۲۔ ابن أبی شیبہ، المصنف، ۷:۸۲، رقم: ۳۴۳۶۱

زبان کا علم ہوتا ہے اور یہ علم بنی نوع انسان کے لیے حجت ہے۔

ملا علی قاری حدیثِ مذکورہ کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

قَدْ يُحْمَلُ الْأَوَّلُ عَلٰى عِلْمِ الْبَاطِنِ، وَالثَّانِي عَلٰى عِلْمِ الظَّاهِرِ.(۱)

پہلے علم کو باطن پر محمول کیا جاتا ہے اور دوسرے کو علم ظاہر پر۔

۵۔ وحی

اپنے اَصلی لغوی معنی کے اعتبار سے وحی 'تیز اشارہ' کو کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

أَصْلُ الْوَحْيِ: الْإِشَارَةُ السَّرِيْعَةُ. (۲)

اصلاً وحی سے مراد تیز اشارہ ہے۔

علماء متکلمین نے **الخبر الصادق** کی اِصطلاح بھی استعمال کی ہے یعنی وہ سچی خبر جو نبیِ برحق سے صادر ہوتی ہے اور یہ خبر صحتِ نبوت کی دلیل ہوتی ہے۔

اَقسامِ وحی

وحی دو اقسام پر مشتمل ہے:

۱۔ وحی جلی

۲۔ وحی خفی

وحی جلی سے مراد وہ علمِ الٰہی ہے جو انبیاء ﷺ پر ان کے ثبوتِ نبوت کی حیثیت سے فرشتے کے ذریعے نازل ہوتا ہے۔ اس سے کتابِ الٰہی یا صحیفۂ الٰہیہ تشکیل پاتا ہے مثلاً

(۱) ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح، ۱:۴۷۸

(۲) راغب اصفہانی، المفردات:۵۱۵

قرآنِ حکیم اور انبیاء ﷺ کی کتب وصحف۔ لیکن قرآن اور صحفِ ماسبق میں امتیاز یہ ہے کہ قرآن اپنے ظاہر و باطن یعنی الفاظ و معانی دونوں کے اعتبار سے صریحاً وحی ہے جبکہ دیگر صحف و کتبِ آسمانی صرف معنی ومفہوم کے لحاظ سے وحی تھیں، الفاظ کے اعتبار سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں لفظاً تحریف اور تبدیلی ہوگئی مگر قرآن میں نہ ہوسکی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ○ (۱)

بے شک یہ ذکرِ عظیم (قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے○

وحیِ خفی سے مراد رسولِ برحق ﷺ کی احادیث ہیں؛ خواہ قولی ہوں، فعلی ہوں یا تقریری۔ یہ معناً وحی ہوتی ہیں اور لفظاً قولِ رسول۔ ارشادِ حق ہے:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی○ (۲)

اور وہ (اپنی) خواہش سے کلام نہیں کرتے○ اُن کا ارشاد سَراسَر وحی ہوتا ہے جو انہیں کی جاتی ہے○

وحی بھی علی الاطلاق ذریعہ علم حقیقت ہے۔ اس میں اور متذکرہ تینوں ذرائع - حواس، عقل اور وجدان - میں فرق یہ ہے کہ وہ تینوں انسان کی نفسی استعدادیں ہیں جبکہ وحی صرف عطاے الٰہی ہے اور انسان کے کسب و دخل سے پاک ہے۔ ان تینوں ذرائع سے حاصل ہونے والا علم سہو و خطا کے اِمکان سے پاک نہیں ہوسکتا جبکہ علم بالوحی ہر قسم کے سہو وخطا سے منزہ ہوتا ہے۔ چنانچہ پہلے تینوں ذرائع ظنی علم مہیا کرتے ہیں اور وحی یقینی علم۔

مذکورہ بالا بحث کا ماحصل یہ ہے کہ پہلے تینوں ذرائع اور ان کے علوم ومشمولات

(۱) الحجر، ۱۵:۹

(۲) النجم، ۵۳:۳-۴

کی صحت و حقانیت کا معیار صرف وحیِ الٰہی اور علومِ نبوت سے مطابقت و موانست ہے۔ اگر انسان کی کسی بھی نفسی اِستعداد کا علم علومِ نبوت سے متعارض ہے تو وہ غلط اور مردود ہے اور اگر ان کے مطابق و موافق ہے تو صحیح اور مقبول ہے۔ اِسی وجہ سے عقل و خرد اور کشف و ولایت دونوں کی صحت و قبولیت اِتباعِ رسالت پر منحصر ہے۔

مآخذ و مراجع

۱۔ **القرآن الحکیم۔**

۲۔ **تفتازانی**، سعد الدین مسعود بن عمر بن عبداللہ (۷۱۲-۷۹۱ھ/۱۳۱۲-۱۳۸۹ء)۔ **شرح العقائد النسفیۃ**۔ قاہرہ، مصر: مکتبۃ الکلیات الازہریۃ، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء۔

۳۔ **دارمی**، ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمٰن (۱۸۱-۲۵۵ھ/ ۷۹۷-۸۶۹ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ۔

۴۔ **راغب اصفہانی**، ابو قاسم حسین بن محمد (م۵۰۲ھ/ ۱۱۰۸ء). **المفردات**۔ لبنان: دار المعرفۃ۔

۵۔ **ابن ابی شیبہ**، ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم بن عثمان کوفی (۱۵۹-۲۳۵ھ/ ۷۷۶-۸۴۹ء)۔ **المصنف**۔ ریاض، سعودی عرب: مکتبۃ الرشد، ۱۴۰۹ھ۔

۶۔ **غزالی**، ابو حامد محمد بن محمد (۴۵۰-۵۰۵ھ)۔ **المنقذ من الضلال**۔ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور، پاکستان: مکتبہ رشیدیہ، ۱۹۷۱ء

۷۔ **غزالی**، ابو حامد محمد بن محمد (۴۵۰-۵۰۵ھ)۔ **إحیاء علوم الدین**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفۃ۔

۸۔ **قشیری**، ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن نیشاپوری (۳۷۶-۴۶۵ھ/ ۹۸۶-۱۰۷۳ء)۔ **الرسالۃ**۔ بیروت، لبنان: دار الجیل۔

۹۔ **ملا علی قاری**، نور الدین بن سلطان محمد ہروی حنفی (م۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۶ء)۔ **مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح**۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء۔